ساتھ ہی اپنی شکست کے خیال نے اُسے کچھ ملول بھی کر دیا۔ یہاں بھی اس کی ہار ہوئی۔
بڑھیا اُوپر گئی ہوئی تھی۔ دیبی دین نے زینے کے پاس جا کر کہا۔ ارے کیا کرتی ہے بہو سے کہہ دے ایک آدمی ان سے ملنے آیا ہے۔
یہ کہہ کر دیبی دین نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ چلو اب سرکار میں تمہاری پیشی ہو گی۔ بہت بھاگے تھے بغیر وارنٹ کے پکڑے گئے۔
رما کا ولولہ اور اشتیاق اُڑا جاتا تھا۔ اس کی شرم اس کے سر پہ سوار ہوتی جاتی تھی۔ جالپا کے سوالوں کا اس کے پاس کیا جواب تھا۔ جس خوف سے وہ بھاگا تھا اس نے بالآخر اس کا پیچھا کر کے اسے مغلوب کر ہی دیا۔ وہ جالپا کے سامنے آنکھیں بھی تو نہ سیدھی کر سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا اور زینہ کے پاس ٹھٹھک گیا۔ دیبی دین نے پوچھا کیوں رک گئے۔
رما نے سر کھجلاتے ہوئے جواب دیا۔ چلو میں آتا ہوں۔ بڑھیا نے اوپر سے کہا۔ پوچھو کون آدمی ہے۔ کہاں سے آیا ہے۔
دیبی دین نے دلگی کی۔ کہتا ہے اب جو کچھ کہوں گا بہو سے کہوں گا۔
کوئی چٹھی لایا ہے۔
ہیں۔
سناٹا ہو گیا۔ دیبی دین نے ایک لمحہ کے بعد کہا۔ کہہ دوں لوٹ جائے۔
جالپا زینہ پر آ کر بولی۔ کون آدمی ہے پوچھتی تو ہوں۔
کہتا ہے بڑی دور سے آیا ہوں۔
ہے کہاں۔
یہ کیا کھڑا ہے۔
اچھا بلا لو۔

رما چادر اوڑھے کچھ جھجکتا کچھ جھینپتا کچھ ڈرتا زینہ پر چڑھا۔ جالپا اسے دیکھتے ہی فوراً دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ دیبی دین وہاں نہ ہوتا تو وہ دو قدم آگے بڑھی ہوتی۔

جالپا کی آنکھوں میں کبھی اتنا سرور نہ تھا جسم میں کبھی اتنی چستی نہ تھی رخسار پر کبھی اتنی چمک نہ تھی، سینہ میں کبھی اتنا ارتعاش نہ تھا۔ آج اس کی تمنا پوری ہوئی۔

(۳۹)

ساری رات باتوں میں گذر گئی۔ دونوں ہی کو اپنی چھ مہینے کی داستان کہنی تھی۔ رما نے اپنا وقار جمانے کے لئے اپنی خستہ حالی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا۔ جالپا نے اپنی داستان میں اپنی تکلیفوں کا ذکر تک نہ کیا وہ ڈرتی تھی انہیں رنج ہوگا۔ لیکن رما کو اسے رُلانے میں مزا آرہا تھا۔ وہ کیوں بھاگا کس لئے بھاگا۔ یہ سارا قصہ اس نے دردناک آواز میں سنایا اور جالپا نے سسک سسک کر سنا۔ وہ اپنی لفاظی سے اس پر رُعب جمانا چاہتا تھا۔ اب تک ہر ایک معاملے میں اس کی ہار ہوتی تھی، جو بات اسے محال معلوم ہوئی تھی اسے جالپا نے چٹکیوں میں پورا کر دکھایا تھا۔ شطرنج والے واقعہ کو وہ خوب نمک مرچ لگا کر بیان کر سکتا تھا۔ لیکن وہاں بھی جالپا ہی غالب رہی۔ پھر اس کے لئے اس کے سوا اور کیا تدبیر رہ گئی تھی کہ اپنی تکلیفوں کو رائی کا پربت بنا کر دکھائے۔

جالپا نے سسک کر کہا۔ تم نے یہ ساری کڑیاں جھیلیں اور مجھ کو ایک خط نہ لکھا کیوں لکھتے ہم سے ناتا ہی کیا تھا۔ منہ دیکھنے کی محبت تھی آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ۔

رما نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ یہ بات نہیں جالپا۔ دل پر جو کچھ گذرتی تھی دل ہی جانتا ہے۔ لیکن لکھنے کا منہ بھی تو ہو۔ جب روپوش ہو کر گھر سے بھاگا تو اپنا قصۂ غم کیا لکھنے بیٹھتا۔ میں نے سوچ لیا تھا جب تک خوب روپے نہ کما لوں گا ایک لفظ بھی نہ لکھوں

گا۔

جالیا نے چشم پُرآب میں طنز بھر کر کہا۔ ٹھیک ہی تھا روپے آدمی سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں۔ ہم تو روپے کے یار ہیں۔ تم چاہے چوری کرو ڈاکہ مارو، جھوٹی گواہی دو، یا بھیک مانگو کسی طرح روپے لاؤ۔ تم نے میری عادت کو کتنا ٹھیک سمجھا ہے کہ واہ!

رما نے جھینپتے ہوئے کہا۔ نہیں نہیں جالپا یہ بات نہ تھی۔ میں یہی سوچتا تھا کہ ان پھٹے حالوں جاؤں گا کیسے۔ سچ کہتا ہوں مجھے سب سے زیادہ خوف تمہیں سے لگتا تھا۔ سوچتا تھا تم مجھے کتنا دغاباز، مکار اور کچے دل کا سمجھ رہی ہو گی۔ شاید میرے دل میں یہ خیال تھا کہ روپے کی تھیلی دیکھ کر تمہارا دل کچھ تو نرم ہو گا۔

جالپا نے اسی ستم ظریفانہ لہجہ میں کہا۔ تو تمہارا وہ خیال غلط تھا۔ میں شاید اس تھیلی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتی بھی نہیں۔ آج مجھے معلوم ہو گیا تم نے مجھے کتنا خود غرض سمجھتے ہو۔ اس میں تمہاری کوئی خطا نہیں، ساری خطا میری ہے۔ اگر میں بھلی ہوتی تو آج یہ دن کیوں آتا۔ جو آدمی تیس چالیس روپے مہینہ کا نوکر ہو اس کی بیوی اگر دو چار روپے خرچ کرے، ہزار دو ہزار کے زیور پہنے تو وہ اپنی اور اپنے شوہر کی تباہی کا سامان کر رہی ہے۔ اگر تم نے مجھے اتنا بندۂ زر سمجھا تو کوئی بے انصافی نہیں کی۔ مگر ایک بار جس آگ میں جل چکی اس میں پھر نہ کودوں گی۔ ان چند مہینوں میں میں نے ان گناہوں کا کفارہ ادا کیا ہے اور جو کچھ باقی ہے وہ آخری دم تک کرتی رہوں گی۔ یہ میں نہیں کہتی کہ عیش و آرام سے میرا جی بھر گیا، یا میرے گہنے کپڑے سے میں اُوب گئی۔ یا سیر تماشہ سے مجھے نفرت ہو گئی۔ یہ ساری تمنائیں جوں کی توں ہیں۔ اگر تم اپنے قوتِ بازو سے اپنی جانفشانی سے انہیں پورا کر سکو تو کیا کہنا۔ لیکن نیت کھوٹی کر کے یا ضمیر کا خون کر کے ایک لاکھ بھی لاؤ تو میں اسے ٹھکرا دوں گی۔ جس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تم پولیس کے گواہ بن گئے ہو مجھے اتنا رنج ہوا کہ دیبا دادا کو ساتھ لے کر تمہارے بنگلے تک گئی۔ اسی

دن تم باہر چلے گئے تھے۔ میں اتنے آدمیوں کا خون اپنی گردن پر نہیں لینا چاہتی۔ تمہیں بیان واپس لینا پڑے گا۔

رما فکرمند ہو کر بولا۔ جب سے تمہارا خط ملا۔ میں اسی معاملہ پر غور کر رہا ہوں۔ لیکن بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ایک بات کہہ کر مکر جانے کی ہمت مجھ میں نہیں ہے۔

بیان تو بدلنا ہی پڑے گا۔

آخر کیسے؟

مشکل کیا ہے۔ جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ میونسپلٹی تمہارے اُوپر کوئی مقدمہ نہیں چلا سکتی تو پھر کس بات کا ڈر۔

ڈر نہ ہو۔ جب بھی تو کوئی چیز ہے جس منہ سے ایک بات کہی۔ اسی منہ سے مکر جاؤں۔ یہ تو مجھ سے نہ ہو گا۔ پھر مجھے کوئی اچھی جگہ مل جائے گی۔ آرام سے زندگی بسر ہو گی۔ مجھ میں گلی گلی ٹھوکر کھانے کا بوتا نہیں ہے۔

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے۔

رما نے پھر پہلو بدلا۔ اور کچھ میری شہادت پر ہی تو سارا فیصلہ نہیں ہوا جاتا۔ میں بدل بھی جاؤں تو پولیس نہایت آسانی سے کوئی دوسرا گواہ کھڑا کر دے گی۔ ملزموں کی جان تو کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ ہاں میں مفت میں مارا جاؤں گا۔

جالپا نے ترش ہو کر کہا۔ کیسی بے شرمی کی باتیں کرتے ہو جی۔ کیا تم اتنے گئے گذرے ہو کہ تمہیں اپنی روٹیوں کے لئے دوسروں کا گلا کاٹنا پڑے۔ میں اسے نہیں برداشت کر سکتی مجھے مزدوری کرنا۔ بھوکوں مر جانا منظور ہے لیکن کسی کا برا چیت کر میں جنت کا راج بھی نہیں لے سکتی۔

رما چڑھ کر بولا۔ تو کیا تم یہ چاہتی ہو کہ میں یہاں قلی گیری کروں۔

جالپا۔ نہیں میں یہ نہیں چاہتی۔ لیکن اگر قلی گیری بھی کرنی پڑے تو وہ خون چیڑی ہوئی روٹیاں کھانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔

رما نے تحمل کے ساتھ کہا۔ جالپا تم مجھے جتنا کمینہ سمجھتی ہو، اتنا کمینہ میں نہیں ہوں۔ بُری بات ہر ایک کو بُری لگتی ہے۔ مجھے بھی اس بات کا رنج ہے کہ میرے ہاتھوں اتنے آدمیوں کا خون ہو رہا ہے۔ لیکن حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے، تم مجھے کیوں اس اونچائی پر چڑھانا چاہتی ہو جہاں پر پہنچنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

جالپا نے پُر ملامت تبسّم کے ساتھ کہا۔ جس آدمی میں خون کرنے کی طاقت ہو اس میں خون نہ کرنے کی طاقت کا نہ ہونا تعجب کی بات ہے، جس میں دوڑنے کی طاقت ہو، اس میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو اسے کون باور کرے گا۔ جب ہم کوئی کام کرنے کا ارادہ کر لیتے ہیں تو طاقت آپ ہی آپ آجاتی ہے، تم بیٹھ کر لو کہ تمہیں بیان بدلنا ہے بس اور ساری باتیں آپ ہی آپ آجائیں گی۔

رما سر جھکائے سنتا رہا۔

جالپا نے پھر اسی رو میں کہا۔ اگر تمہیں یہ پاپ کی کھیتی کرنی ہے تو مجھے آج ہی یہاں سے رخصت کر دو۔ میں آج منہ میں کالکھ لگا کر چلی جاؤں گی۔ پھر تمہیں دق کرنے نہ آؤں گی۔ تم زندگی کے مزے اٹھانا، میں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ بھر لوں گی۔

رما کے دل میں کچھ چوٹ لگی، سر کھجلا کر بولا۔ چاہتا تو میں بھی ہوں کہ کسی طرح میری گلو خلاصی ہو جائے۔

جالپا نے جواب دیا تو پھر کرتے کیوں نہیں۔ اگر تمہیں کہتے شرم آتی ہے تو میں کہوں یہی اچھا ہوگا میں تمہارے ساتھ چلی چلوں گی اور تمہارے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے سارا ماجرا کہہ سناؤں گی۔

رما کا پس و پیش غائب ہو گیا۔ اپنی اتنی ذلت وہ کرانا نہ چاہتا تھا بولا۔ تمہارے

چلنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جالپا میں اُن لوگوں کو سمجھا لونگا۔

جالپا نے مزید اطمینان کے لئے پوچھا، تو وعدہ کرتے ہو۔ اپنا بیان بدل دوگے؟

رمانے سرگرمی سے کہا، ہاں کہتا تو ہوں۔

میرے کہنے سے یا اپنے دل سے۔

تمہارے کہنے سے نہیں اپنے دل سے۔ مجھے خود ایسی باتوں سے نفرت ہے کچھ جھجک تھی وہ تم نے نکال دی۔

پھر اور باتیں ہونے لگیں، کیسے پتہ چلا کہ رمانے روپے خرچ کر ڈالے۔ روپے ادا کیسے ہو گئے۔ رتن پر کیا گزری؟ گوپی کیوں اتنی جلدی بھاگ گیا۔ دونوں کچھ کچھ پڑھ رہے ہیں یا اسی طرح آوارہ پھر رہے ہیں۔ اماں تو بہت نہیں روتی ہیں۔ دادا کے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ یہ ساری باتیں ہو گئیں، پھر زندگی کے منصوبے باندھے جانے لگے۔

جالپا نے کہا۔ چلو وہاں رتن سے تھوڑی زمین لے لیں اور کھیتی باڑی کریں!

رمانے کہا۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ یہاں چائے کی دکان کھول لیں، اس پر دونوں ہی مباحثہ ہوا۔ آخر رما کو ہار ماننی پڑی۔ یہاں رہ کر وہ گھر کی دیکھ بھال نہ کر سکتا تھا، بھائیوں کی نگرانی نہ کر سکتا تھا، اور ماں باپ کی کچھ خدمت نہ کر سکتا تھا۔ آخر گھر والوں کے ساتھ بھی تو اس کا کچھ فرض ہے، رما لاجواب ہو گیا۔

(۴۰)

رما منہ اندھیرے جنگلہ پر پہنچا کسی کو شبہ نہ ہوا۔

ناشتہ کر کے رما ناتھ نے حساب صاف کیا اور داروغہ کے پاس پہنچا، تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں، داروغہ نے پوچھا۔ خیریت تو ہے نوکروں نے کوئی شرارت تو نہیں کی۔

رما نے کھڑے کھڑے جواب دیا، نوکروں نے شرارت نہیں کی۔ ہاں آپ نے اور

آپ کے افسروں نے اور ماتحتوں نے مجھے چوکا دیا ہے۔

داروغہ نے کچھ پریشان ہو کر پوچھا۔ آخر بات کیا ہے کچھ کہئے تو؟

رما۔ بات یہی ہے کہ میں اس معاملے میں اب مطلق شہادت نہیں دونگا۔ آپ لوگوں نے مجھے دغا دی اور وارنٹ کی دھمکی دے کر مجھے شہادت پر مجبور کیا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے اُوپر کسی قسم کا الزام نہیں ہے۔ میں پولیس کی طرف سے شہادت نہیں دینا چاہتا۔ میں آج جج صاحب سے صاف کہہ دوں گا۔

داروغہ نے اُسے مرعوب کرنے کی کوشش کر کے کہا۔ آپ نے خود غبن تسلیم کیا تھا۔

رما۔ وہ میزان کی غلطی تھی۔ غبن نہ تھا۔

یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا۔

اس سے آپ کو کوئی بحث نہیں۔ میں شہادت نہ دونگا۔ جن تاریخوں کا یہ وقوعہ ہے۔ ان تاریخوں میں میں الہ آباد میں تھا۔ میونسپل آفس میں میری حاضری درج رجسٹر ہے۔

داروغہ نے اس معاملہ کو ہنسی میں اڑا کر کہا۔ اچھا صاحب پولیس نے آپ کو دھوکہ دیا۔ لیکن اس کا خاطر خواہ انعام تو دینے کو حاضر ہے۔ کوئی اچھی جگہ مل جائے گی موٹر پر بیٹھے سیر کرو گے۔ خفیہ پولیس کی کوئی جگہ مل گئی تو چین ہی چین ہے۔ سوچو سرکار کی نظروں میں کتنا رسوخ بڑھ گیا۔ یوں مارے مارے پھرتے یوں کہو کہ تمہاری ترقی کا دروازہ کھل گیا۔ اچھی کارگذاری دکھائی تو ایک دن رائے بہادر ہو جاؤ گے۔ تمہیں ہمارا احسان ماننا چاہیئے اور آپ اُلٹے خفا ہوتے ہیں۔

رما پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بولا۔ میں ایسی ترقی سے درگذرا۔ وہ آپ ہی کو مبارک رہے۔

اتنے میں ڈپٹی اور انسپکٹر دونوں آپہنچے۔ رما کو دیکھ کر انسپکٹر صاحب نے فرمایا۔ ہمارے بابو صاحب تو آج پہلے ہی سے تیار بیٹھے ہیں۔ بس آج کی کارگذاری پر وارا نیارا ہے۔

رما جی ہاں۔ آج وارا نیارا کردوں گا۔ اتنے دنوں تک آپ لوگوں کے اشاروں پر چلا۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھ کر چلوں گا۔

انسپکٹر نے درد غہ کا منہ دیکھا۔ درد غہ نے ڈپٹی کا منہ دیکھا۔ یہ لونڈا کیا کہتا ہے انسپکٹر صاحب نے استعجاب سے کہا۔ کیا معاملہ ہے۔ حلف سے کہتا ہوں۔ آپ کچھ ناراض معلوم ہوتے ہیں۔

رما۔ میں نے اپنا بیان تبدیل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ بے گناہوں کا خون نہیں کرنا چاہتا۔

انسپکٹر نے اسے نگاہِ ترحم سے دیکھ کر کہا۔ آپ بے گناہوں کا خون نہیں کر رہے ہیں۔ صاحب اپنی تقدیر کی عمارت کھڑی کر رہے ہیں۔ حلف سے کہتا ہوں ایسے موقع بہت کم آدمیوں کو ملتے ہیں۔ آج کیا بات ہوئی کہ آپ اتنے خفا ہوگئے۔ آپ کو کچھ معلوم ہے درد غہ جی! اگر کسی نے آپ کے مزاج کے خلاف کوئی حرکت کی ہو تو اس کی گوشمالی کیجئے۔

درد غہ۔ میں ابھی جا کر تحقیقات کرتا ہوں۔

رما۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے کسی سے شکایت نہیں ہے۔ میں اپنے فائدے کے لئے اپنے ضمیر کا خون نہیں کرنا چاہتا۔

ایک منٹ سناٹا رہا۔ کسی کو کوئی بات نہ سوجھی۔ درد غہ کوئی دوسرا چکمہ سوچ رہے تھے۔ انسپکٹر صاحب کوئی دوسری ترغیب۔

دفعتہً ڈپٹی صاحب نے کہا۔ رما بابو یہ اچھا بات نہ ہوگا۔

رما نے دلیری کے ساتھ کہا۔ آپ کے لئے نہ ہوگا۔ میرے لئے تو سب سے اچھی بات ہے۔

ڈپٹی۔ نہیں آپ کے لئے اس سے بُرا دوسرا بات نہیں ہے۔ ہم آپ کو چھوڑے گا نہیں۔ تم کو ایسا لین دے گا کہ تم عمر بھر نہ بھولے گا۔ آپ کو وہی گواہی دینا ہوگا جو پہلے دے چکا ہے۔ اگر کچھ بھی گول مال کیا ہم تمہارے ساتھ دوسرا برتاؤ کرے گا۔ ایک رپورٹ میں تم لوں دکلائیوں کو نیچے اوپر رکھ کر، چلا جائے گا۔

رما سہم اُٹھا۔ اس تخویف نے اسے لرزہ براندام کر دیا۔ کہیں یہ سب کوئی جھوٹا مقدمہ چلا کر اسے پھنسا دیں تو کون اس کی فریاد سُنے گا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ڈپٹی صاحب جو اخلاق اور مروّت کے پتلے بنے ہوئے ہیں یک بارگی اتنے طیش میں آجائیں گے پھر بھی خود داری کے ساتھ بولا آپ مجھ سے جبراً شہادت دلوائیں گے۔

ڈپٹی نے پیر ٹپک کر کہا، ہاں جبراً دلائے گا۔

رما۔ واہ! اچھی دل لگی ہے۔

ڈپٹی۔ تم نے ابھی پولیس کی چال نہیں دیکھی ہے۔ ہم ابھی دو گواہ دے کر تم پر بغاوت کا کیس چلا سکتا ہے، بس چلا جائے گا۔ سات سال کے لئے چکّی پیستے پیستے ہاتھ میں چھالے پڑ جائیں گے۔ یہ چکنا چکنا منہ نہیں رہے گا۔

رما جیل سے ڈرتا تھا۔ جیل کی زندگی کے خیال سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ جیل ہی کے خوف سے اس نے یہ شہادت دینی منظور کی تھی، وہی خوف اس وقت بھی اس کے دل میں رعشہ پیدا کرنے لگا۔ ڈپٹی نفسیات کا ماہر تھا آسن کا پتہ پا گیا اسی لہجہ میں بولا حلوا پوری نہیں پائے گا دھول ملا ہوا آٹا کا روٹی۔ گوبھی کے سڑے ہوئے پتوں کا ساگ کھانے کو پائے گا، چار مہینہ بھی کال کوٹھری ہو گیا تو تم بچ نہیں سکتا وہیں مر جائے گا۔ بات بات پر وارڈر گالی دے گا، جوتوں سے پیٹے گا تم سمجھتا کیا ہے۔

رما کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اپنی کمزوری پر اتنا ملال ہوا کہ رو پڑا۔ کانپتی

ہوئی آواز سے بولا۔ آپ لوگوں کی یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ بھیج دیجئے جیل مریں تو بھاؤں گا گلا تو چھوٹ جائے گا۔ جب آپ یہاں تک مجھے تباہ کرنے پر آمادہ ہیں تو میں بھی مرنے کو تیار ہوں۔ جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائے گا۔

اس کا دل ضعف کی اس حالت کو پہنچ گیا تھا جب ذرا سی ہمدردی، ذرا سی شفقت سینکڑوں دھمکیوں سے زیادہ کارگر ہو جاتی ہے۔ انسپکٹر صاحب نے اس کی نبض پہچان لی۔ اس کی حمایت کرتے ہوئے بولے۔ حلف سے کہتا ہوں آپ لوگ آدمی کو پہچانتے تو ہیں نہیں لگتے ہیں رعب جمانے۔ اس قسم کی شہادت دینا ہر ایک ذی فہم آدمی کو ناگوار گزرے گا۔ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ بابو کی جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سے منحرف ہو جائیں گے۔ آپ لوگ اپنا کام کیجئے۔ بابو صاحب کی طرف سے مطمئن رہیئے۔ میں ان کا ذمہ لیتا ہوں۔

اس نے رما کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ آپ ڈپٹی صاحب کی گیدڑ بھبکیوں میں آ گئے۔ آیئے میرے ساتھ چلیئے۔ ایسے ایسے ریکارڈ سناؤں کہ طبیعت پھڑک اٹھے۔

رما نے رُندھے ہوئے لڑکے کی طرح ہاتھ چھڑا کر کہا۔ مجھے دق نہ کیجئے انسپکٹر صاحب اب تو مجھے جیل خانے میں مرنا ہے۔

انسپکٹر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو بھائی جان۔ جیل خانے میں مریں آپ کے دشمن۔

ڈپٹی نے تسمہ بھی باقی نہ چھوڑنا چاہا۔ اس طرح بولا۔ گویا رما سے کبھی جان پہچان نہیں ہے۔ صاحب ہم تمہارے ساتھ سب طرح کا سلوک کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن جب تم ہمارا ہاتھ بڑھا دو گے تو ہم بھی اپنا کارروائی کرے گا۔ ضرور سے کرے گا۔ کبھی نہیں چھوڑ نہیں سکتا۔

اسی وقت سرکاری ایڈووکیٹ اور بیرسٹر موٹر سے اترے۔

(۷۱)

رتن اپنے خطوں میں جالیا کو تشفی دیتی رہتی تھی، مگر اپنے بارے میں کچھ نہ لکھتی تھی جو خود ہی مبتلائے غم ہو اُسے اپنی مصیبت کی کہانی کیا سنائے جس نے روپوں کی کبھی کوئی حقیقت نہ سمجھی، وہ ایک ہی مہینہ میں روٹیوں کی محتاج ہو رہی تھی۔ پہلے بھی اس کی زندگی پر عافیت نہ تھی۔ لیکن اسے کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ مریل گھوڑے پر سوار ہو کر بھی سفر پورا کیا جا سکتا ہے۔ اگر سڑک اچھی ہو تو کر جا کر اور کھانے پینے کا سامان ساتھ ہو۔ گھوڑا بھی تیز ہو تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ رتن کی حالت بھی اسی سوار کی سی تھی۔ اسی سوار کی طرح وہ آہستہ آہستہ زندگی کے مرحلے طے کرتی جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ گھوڑے پر جھنجلاتی ہو گی۔ دوسرے سواروں کو آگے بڑھتے دیکھ کر اُسے خواہش ہوتی ہو گی کہ اس کا گھوڑا بھی اتنا ہی تیز خرام ہوتا۔ لیکن وہ رنجیدہ نہ تھی۔ اپنے نصیبوں کو نہ روتی تھی۔ وہ اس گائے کی طرح تھی جو ایک پیلی سی پگھیا کے بندھن میں پڑ کر اپنی ناند کے بھوسے کھلی میں مگن رہتی تھی سامنے ہرے بھرے میدان ہیں اس میں اشتہا انگیز گھاس لہرا رہی ہے مگر رسی توڑ کر کبھی ادھر نہیں جاتی۔ اس کے اس رسی اور لوہے کی زنجیر میں کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔

عالمِ شباب میں محبت کی اتنی پیاس نہیں ہوتی جتنی خود نمائی کی یہ پیاس بعد کو آتی ہے۔ رتن کو خود نمائی کے سبھی سامان ملے ہوئے تھے۔ اس کا شباب میں مست دل اپنی زیبائش میں خوش تھا ہنسی مذاق۔ سیر و تفریح۔ کھانا پینا یہی اس کی زندگی تھی اس سے گہرے پانی میں اُسے جانے کی نہ خواہش تھی نہ غرض۔ فارغ البالی بہت کچھ رنج و محن کا ازالہ کرتی رہتی ہے۔ اس کے پاس اپنی مصیبتوں کو بھلانے کے لئے کتنے ہی سامان ہیں۔ سنیما ہیں سیر و سیاحت ہے۔ کتابوں کا مطالعہ ہے شر دو دستار ہے پالتو جانور ہیں لیکن افلاس کو بھلانے کا انسان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ بجز اس کے کہ وہ روئے اپنی تقدیر کو، کوسے اور دنیا سے مایوس ہو کر خودکشی کرلے۔ رتن کی تقدیر نے پلٹا کھایا تھا۔

اور یہ ہوا اپنے ہی ہاتھوں۔ پنڈت جی ان آدمیوں میں تھے جنہیں موت کی فکر نہیں ہوتی۔ انہیں کسی طرح یہ خیال ہوگیا تھا کہ دائم المریض آدمی اگر احتیاط اور پرہیز سے رہے تو اس کی عمر دراز ہوسکتی ہے وہ پرہیز اور احتیاط کے دائرے سے باہر کبھی نہیں جاتے تھے۔ پھر موت کو ان سے کیا دشمنی تھی جو خواہ مخواہ ان کے پیچھے پڑتی۔ اپنی وصیت لکھنے کا خیال انہیں اس وقت آیا جب قریب المرگ ہوئے۔ لیکن رتن وصیت کا نام سنتے ہی اتنی پریشان اور غمگین ہوئی کہ پنڈت جی نے اسے اس وقت ملتوی کرنا ہی مناسب سمجھا۔ تب سے انہیں اتنا ہوش نہ آیا کہ وصیت لکھواتے۔

پنڈت جی کی وفات کے بعد رتن دنیا سے اس قدر بیزار ہوگئی کہ اسے کسی بات کی بھی سدھ بدھ نہ رہی تھی۔ یہ وہ موقع تھا جب اسے خاص طور پر ہوشیار رہنا چاہیئے تھا۔ گویا دشمنوں نے اسے گھیر رکھا ہو۔ مگر اس نے سب کچھ منی بھوشن پر چھوڑ دیا اور اس منی بھوشن نے رفتہ رفتہ اس کا سارا اثاثہ ہضم کرلیا۔ ایسا سوانگ بھرا کہ سادہ لوح رتن کو اس کی فتنہ انگیزیوں کی بھنک تک نہ ملی۔ پھنڈا جب خوب کس گیا تو اس نے ایک دن رتن سے آکر کہا۔ آج بنگلہ خالی کرنا ہوگا۔ میں نے اسے بیچ دیا ہے۔

رتن نے تیز ہو کر کہا۔ میں نے تو تم سے کہا تھا ابھی بنگلہ نہ بیچوں گی۔

منی بھوشن نے ظاہرداری کا پردہ اتار پھینکا اور بولا۔ آپ میں یہ بہت بڑا عیب ہے کہ آپ ایک بات کہہ کر اسے بھول جاتی ہیں۔ اسی کمرے میں میں نے آپ سے یہ ذکر کیا تھا اور آپ نے یہ حامی بھری تھی۔ جب میں نے بنگلہ بیچ دیا تو آپ یہ رنگ لائیں۔ بنگلہ آج خالی کرنا ہوگا اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔

میں ابھی یہیں رہنا چاہتی ہوں۔

میں آپ کو یہاں نہ رہنے دونگا۔

میں تمہاری لونڈی نہیں ہوں۔

آپ کی خبر گیری کا بار مجھ پر ہے۔ اپنے خاندان کے حفظ و وقار کے لئے میں آپ کو اپنے
ھ لے جاؤں گا۔

رتن نے ہونٹ چبا کر کہا۔ میں اپنی عصمت کی حفاظت خود کر سکتی ہوں۔ تمہاری مدد
ضرورت نہیں۔ میری اجازت کے بغیر تم کوئی چیز فروخت نہیں کر سکتے۔

منی بھوشن نے گویا سی ماری۔ آپ کا اس گھر پر اور چچا صاحب کی جائداد پر کوئی
ہیں ہے۔ یہ میری ملکیت ہے۔ آپ مجھ پر صرف گذارے کا دعویٰ کر سکتی ہیں۔

رتن نے حیرت میں آ کر کہا۔ تم کچھ بھنگ تو نہیں کھا گئے ہو؟

منی بھوشن نے بے دردانہ انداز سے کہا۔ میں اتنی بھنگ نہیں کھاتا کہ بے سر پیر کی
باتیں کرنے لگوں۔ آپ تو پڑھی لکھی ہیں ایک بڑے وکیل کی بیوی ہیں۔ قانون کی بہت
باتیں جانتی ہوں گی۔ مشترکہ خاندان کی بیوہ کا شوہر کی جائداد پر کوئی حق نہیں ہوتا۔
چا صاحب اور میرے والد میں کبھی علیحدگی نہیں ہوئی۔ چچا صاحب یہاں تھے ہم لوگ
دور میں تھے مگر اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ہم میں علیحدگی تھی۔ اگر چچا صاحب
نی جائداد آپ کو دینا چاہتے تو کوئی وصیت ضرور لکھ جاتے۔ اور اگرچہ قانوناً اس
صیت کی کوئی وقعت نہ ہوتی، مگر ہم اس کا احترام کرتے۔ مرحوم کا کوئی وصیت نہ
نا ثابت کر رہا ہے کہ وہ آپ کے ساتھ کوئی خاص سلوک نہ کرنا چاہتے تھے۔ آج آپ کو بنگلہ
الی کرنا ہوگا۔ دوسرے سامان بھی نیلام کر دیئے جائیں گے۔ آپ کی مرضی ہو میرے ساتھ
لیں یا یہیں رہیں۔ یہاں رہنے کے لئے آپ کو دس پندرہ روپے کا مکان کافی ہوگا۔ گذارہ
ے لئے پچاس روپے مہینہ کا انتظام میں نے کر دیا ہے۔ کل مطالبات ادا کرنے کے بعد
س سے زیادہ گنجائش ہی نہیں ہے۔

رتن نے کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر وہ مفلوج سی بیٹھی رہی۔ پھر موٹر منگوائی اور
سارا دن وکیلوں کے پاس دوڑتی پھرتی۔ کتنے ہی وکیلوں سے پنڈت جی کا یارانہ تھا۔ ہر

ایک نے اس کی حالت سن کر رنج کیا، اور وکیل صاحب کے وصیت نہ لکھ جانے پر تعجب کرتے رہے۔ اب اس کے لئے صرف ایک ہی راستہ تھا، وہ یہ ثابت کر دے کہ وکیل صاحب اور ان کے بھائی میں علیحدگی ہو گئی تھی اور یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہ تھا، تو رتن کا اس جائداد پر قبضہ ہو جائے گا۔ ورنہ اس کے لئے کوئی چارہ نہ تھا۔

رتن شام کو گھر لوٹ آئی۔ اس نے فیصلہ کیا جو کچھ میرا نہیں ہے اسے لینے کے لئے میں جھوٹ کا سہارا نہ لوں گی۔

اتنے دنوں میں وہ اپنے کو اس گھر کی مالکن سمجھتی رہی۔ یہ کتنی بڑی غلطی تھی۔ شوہر کی زندگی میں جو لوگ اس کا منہ تاکتے تھے وہ آج اس کے مخدوم بنے ہوئے ہیں۔ یہ ذلت رتن جیسی خوددار عورت کے ناقابلِ برداشت تھی۔ مانا کمائی پنڈت جی کی تھی۔ لیکن یہ گاؤں تو اسی نے خریدا تھا۔ کئی مکان تو اس نے اپنے ہاتھوں بنوا لئے۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی یہ خیال نہ کیا تھا کہ ایک دن یہ جائداد اس کی زندگی کی کفیل ہوگی۔ اسے اس جائداد کے خریدنے میں اس کی ترقی اور تنظیم میں وہی مسرت ہوتی تھی جو ماں اپنی اولاد کے پھلتے پھولتے دیکھ کر حاصل کرتی ہے۔ اس میں غرض کا شائبہ بھی نہ تھا محض اپنے پن کا غرور تھا۔ وہی محبت تھی۔ لیکن شوہر کی آنکھیں بند ہوتے ہی اس کے پالے اور گود کے کھلائے ہوئے بچے بھی اس کی گود سے چھین لئے گئے۔ اس کا ان پر اب کوئی اختیار نہیں۔ اگر وہ جانتی کہ ایک دن یہ مسئلہ ضرور پیش ہوگا تو وہ چاہے روپے کو لٹا دیتی، خیرات کرتی مگر ملکیت کی میخ اپنے سینے میں نہ گاڑتی۔ کیا گرمیوں میں وہ منصوری یا نینی تال نہ جا سکتی تھی۔ ایک کیا دو دو چار نوکر اور نہ رکھے جا سکتے تھے۔ اگر وہ زیور ہی بنوانی تو ایک ایک مکان کی قیمت کا ایک ایک زیور بنوا سکتی تھی۔ مگر اس نے نفس کو کبھی پاؤں نہ پھیلانے دیا۔ کیا اسی نفس کشی کا یہی صلہ تھا۔ جو چیز کل تک اس کی تھی آج اس کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتی۔ کل تک وہ دوسروں کی پرورش کرتی تھی آج وہ خود دوسروں کی محتاج

ہے۔

دفعتہً اس کے خیال میں ایک تغیر ہوا۔ وہ کیوں اپنے کو بیکس سمجھے، کیوں غیروں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ دنیا میں لاکھوں ہی عورتیں دیدہ ریزی کر کے اپنی گذر بسر کرتی ہیں۔ کیا وہ کپڑا نہیں سی سکتی۔ کسی چیز کی چھوٹی موٹی دکان نہیں رکھ سکتی۔ لڑکوں کو بھی پڑھا سکتی ہے۔ یہی تو ہوگا لوگ ہنسیں گے مگر اسے ہنسی کی کیا پرواہ۔ یہ اس کی ہنسی نہیں ہے اپنی قوم کے رسم و رواج کی ہنسی ہے۔

شام کو دروازے پر کئی ٹھیلے والے آ گئے۔ منی بھوشن نے آ کر کہا۔ میں نے ایک مکان طے کر لیا ہے آپ جو چیزیں کہیں لدوا کر بھیجدوں۔

رتن نے بے اعتنائی کے ساتھ کہا۔ اب مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں، نہ تم میرے لئے کوئی مکان ہی لو۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں وہ میں ہاتھ سے بھی نہیں چھو سکتی۔ میں اپنے گھر سے لے کر کچھ نہیں آئی تھی، اسی طرح لوٹ جاؤں گی۔

منی بھوشن نے شرمندہ ہو کر کہا۔ آپ کا سب کچھ ہے، یہ آپ کیسے کہتی ہیں کہ آپ کا کچھ اختیار نہیں۔ آپ وہ مکان دیکھ لیں، میں تو سمجھتا ہوں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

رتن نے طنزیہ انداز سے کہا۔ اتنا بڑا مکان لے کر میں کیا کروں گی۔ میرے لئے ایک کوٹھری کافی ہے جو دو روپیہ میں مل جائے گی۔ سونے کے لئے زمین ہی ہے احسان کا بوجھ سر پر جتنا ہی کم ہو اتنا ہی اچھا۔

منی بھوشن نے عاجزی سے کہا۔ آخر آپ چاہتی کیا ہیں کچھ تو کہئے۔

رتن نے جواب دیا۔ میں کچھ نہیں چاہتی، میں اس گھر کا ایک تنکا بھی اپنے ساتھ نہ لے جاؤں گی۔ جس چیز پر میرا کوئی اختیار نہیں، وہ میرے لئے ویسی ہی ہے جیسے کسی غیر کی چیز۔ تم ان چیزوں کے مالک ہوتے جاؤ میں ذرا بھی برا نہیں مانتی۔ رحم کی چیز نہ زبردستی لی جا سکتی ہے نہ زبردستی دی جا سکتی ہے۔ دنیا میں ہزاروں بیوہ عورتیں پڑی ہوئی ہیں میں

بھی انہیں میں سے ایک ہوں۔ میں بھی انہیں کی طرح مزدوری کروں گی۔ اور نہ کر سکوں گی تو گڑھے میں ڈوب مروں گی۔ جو اپنا پیٹ بھی نہ پال سکے اسے زندہ رہ کر دوسروں کے ا بار بننے کا کوئی حق نہیں ہے۔

یہ کہتی ہوئی رتن گھر سے نکلی۔ اور دروازے کی طرف چلی۔ منی بھوشن نے اس راستہ روک لیا۔ اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو میں ابھی بنگلہ نہ بیچوں۔

رتن نے جلتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما یا ہوا آنسوؤں کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو روک کر بولی۔ میں نے کہہ دیا اس گھر کی کسی چیز میرا دعویٰ نہیں ہے۔ میں کرائے کی لونڈی تھی، لونڈی کا گھر سے کیا تعلق، نہ جانے کس پاپی نے یہ قانون بنایا تھا اگر ایشور کہیں ہے اور اس کے یہاں انصاف ہوتا ہے تو دن اسی کے سامنے اس پاپی سے پوچھوں گی۔ کیا تیرے گھر میں ماں بہن نہ تھیں بچی اس کی توہین کرتے شرم نہ آئی۔ اگر میری زبان میں اتنی طاقت ہوتی کہ اس کی آواز سارے ملک میں پہنچا سکتی تو میں اپنی بہنوں سے کہتی، بہنو! کسی مشترکہ خاندان میں ت مت کرنا۔ اور اگر کرنا تو جب تک اپنا گھر الگ نہ بنا لینا آرام کی نیند مت سونا، خ تمہارے لئے پھولوں کی سیج نہیں کانٹوں کا بستر ہے، تمہیں پار لے جانے والی کشتی تمہیں نگل جانے والا جانور ہے۔

شام ہو گئی تھی۔ گرد سے بھری ہوئی پھاگن کی ہوا چلنے والوں کی آنکھوں میں دھواں جھونک رہی تھی، رتن چادر سنبھالتی ہوئی سڑک پر چلی جا رہی تھی، راستہ بہ پہچان کی عورتوں نے اسے ٹوکا، کئی نے اپنی موٹر روک لی اور اسے بیٹھنے کو کہا، رتن کو ان کی ہمدردی اس وقت تیر سی لگ رہی تھی، وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی جالپا کے گھر جا رہی تھی۔ آج اس کی اصلی زندگی کا آغاز تھا۔

(۴۲)

ٹھیک دس بجے جالپا اور دیبی دین کچہری پہنچ گئے۔ تماشائیوں کی کافی بھیڑ تھی۔ اوپر کی گیلری تو بھری ہوئی تھی، ہزاروں آدمی سامنے کے میدان میں کھڑے تھے۔ جالپا اوپر گیلری میں جا بیٹھی۔ دیبی دین برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

اجلاس پر جج کے ایک طرف پولیس کے کئی محکمے کھڑے تھے۔ سامنے کٹہرے کے باہر دونوں طرف کے وکیل کھڑے مقدمہ پیش ہونے کا انتظار کر رہے تھے ملزموں کی تعداد پندرہ سے کم نہ تھی۔ سب کٹہرے کے نیچے زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ سبھی کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں اور پیروں میں بیڑیاں۔ کوئی لیٹا تھا کوئی بیٹھا تھا۔ دو پنجے لڑا رہے تھے۔ دو میں کسی مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ سبھی بشاش تھے۔ انتشار مایوسی یا غم کا کسی کے چہرے پر نشان نہ تھا۔

گیارہ بجتے بجتے مقدمہ کی پیشی ہوئی۔ پہلے پولیس کی شہادتیں ہوئیں۔ آخر میں کوئی تین بجے رمانا تھ کچہری میں لایا گیا۔ تماشائیوں میں سنسنی پھیل گئی۔ کوئی تنبولی کی دکان سے پان کھاتا ہوا بھاگا۔ کسی نے اخبار کو مروڑ کر جیب میں رکھا۔ اور اجلاس کی طرف دوڑا جالپا بھی سنبھل کر بارجے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ چاہتی تھی ایک بار رما کی آنکھیں اٹھ جائیں اور وہ اسے دیکھ لیتی۔ لیکن رما سر جھکائے کھڑا تھا۔ گویا آنکھیں اٹھاتے ڈر رہا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ رہا تھا۔ کچھ سہما ہوا، گھبرایا ہوا اس طرح کھڑا تھا۔ گویا اسے کسی نے باندھ رکھا ہے اور بھاگنے کی راہ نہیں ہے۔ جالپا کا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا جیسے اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو رہا ہے۔

رما کا بیان شروع ہوا۔ پہلا ہی جملہ سن کر جالپا کانپ اٹھی۔ دوسرے جملے نے اس کی تیوریوں پر بل ڈال دیے۔ تیسرے جملے نے اس کے چہرے کا رنگ فق کر دیا۔ اور چوتھا جملہ سننا تھا کہ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر پیچھے رکھی ہوئی کرسی پر گر پڑی

مگر پھر دل نہ مانا۔ اب جنگلے پر جھک کر وہ ابدنہرکان ہی لگا دیئے۔ وہی پولیس کی سکھائی ہوئی شہادت تھی۔ جس کا خلاصہ وہ دیبی دین کے منہ سے سن چکی تھی، عدالت میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جالپا نے کئی بار کھانسا کہ شاید رما کی آنکھیں اب بھی اوپر اٹھ جائیں۔ لیکن رما کا سر اور بھی جھک گیا۔ معلوم نہیں اس نے جالپا کے کھانسنے کی آواز پہچان لی یا ندامت کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ اس کی آواز کچھ اور دھیمی ہو گئی۔

ایک خاتون نے جو جالپا کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھی، ناک سکوڑ کر کہا۔ جی چاہتا ہے کہ اس شیطان کے گولی مار دے۔ ایسے ایسے خود غرض لوگ بھی اس بدنصیب دیش میں پڑے ہیں جو تھوڑے فائدے کے لئے بے گناہوں کا گلا دباتے بھی نہیں ہچکچاتے۔

جالپا نے کوئی جواب نہ دیا۔

ایک دوسری خاتون نے جو آنکھوں پر عینک لگائے ہوئے تھیں تلملا کر کہا۔ اس بدنصیب ملک کا ایشور ہی مالک ہے۔ گورنری تو لالہ کو کہیں مل نہیں جاتی۔ زیادہ سے زیادہ کلرکی مل جائے گی۔ اس کے لئے اپنا ایمان بیچے ڈالتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت کمینہ آدمی ہے۔

تیسری عورت نے عینک والی دیوی سے مسکرا کر پوچھا۔ آدمی تو فیشن ایبل اور پڑھا لکھا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا تم اسے پا جاؤ تو کیا کرو۔

عینک والی عورت نے جوش سے کہا۔ ناک کاٹ لوں۔ بس نکٹا بنا کر چھوڑ دوں۔

جانتی ہو میں کیا کروں۔

نہیں۔ شاید گولی مار دو گی۔

نہیں گولی نہ ماروں گی۔ سر بازار کھڑا کر کے پانچ جوتے لگواؤں۔ چاند گنجی ہو جائے۔

تمہیں ذرا بھی رحم نہ آئے گا۔

یہ کچھ کم رحم ہے۔ اس کی پوری سزا تو یہ ہے کہ کسی اونچی پہاڑی سے ڈھکیل دیا جائے۔
ایک ضعیفہ نے ان دیویوں کو ملامت کرتے ہوئے کہا، کیوں مفت میں منہ خراب کرتی ہو۔ یہ غریب نفرت کے قابل نہیں، رحم کے قابل ہے۔ دیکھتی نہیں ہو اس کا چہرہ کیسا زرد ہو گیا ہے، جیسے کوئی اس کا گلا دبائے ہوئے ہے۔ اپنی ماں یا بہن کو دیکھ لے تو ضرور رو پڑے۔ آدمی کا دل بُرا نہیں ہے، پولیس نے مار پیٹ کر سیدھا کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے ایک ایک لفظ اس کے دل کو چیر چیر کر نکل رہا ہے۔

عینک والی خاتون نے طعنہ مارا۔ جب اپنے پاؤں میں کانٹا چبھتا ہے جبھی آہ نکلتی ہے۔

جالپا اب وہاں نہ ٹھہر سکی۔ ایک ایک لفظ چنگاری کی طرح اس کے دل پر لگتا تھا۔ دل میں ایسا اُبال آتا تھا کہ اسی وقت اٹھ کر کہدے کہ یہ شخص بالکل جھوٹ بول رہا ہے اور اسی وقت اس کا ثبوت دے دے۔ اس غصہ جائز کو پوری طرح طاقت سے دبائے ہوئے تھی۔ اس کا ضمیر اس کے تحمل پر اسے تحسین کر رہا تھا، کیوں وہ اسی وقت ساری کیفیت بیان نہیں کر دیتی۔ پولیس اس کی دشمن ہو جائے گی ہو جائے۔ عدالت کو کچھ خیال ہوگا۔ ممکن ہے غریبوں کی جان بچ جائے۔ کم سے کم عوام کو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ جھوٹی شہادت ہے اس کے منہ سے ایک بار آواز نکلتے نکلتے رہ گئی۔

آخر وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی آئی۔

دیبی دین اسے اُترتے دیکھ کر برآمدے میں چلا آیا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا۔ کیا گھر چلتی ہو بہوجی!

جالپا نے آنسوؤں کی یورش کو روک کر کہا۔ ہاں اب یہاں نہیں بیٹھا جاتا۔

احاطہ سے باہر نکل کر دیبی دین نے جالپا کو تشفی دینے کے ارادے سے کہا۔ پولیس نے جسے ایک بار بُوٹی سنگھا دی، اس پر کسی دوسری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔

جالپا نے کچھ جواب نہ دیا۔ کچھ دور تک دونوں خاموش چلتے رہے۔ یکایک جالپا نے کہا۔ کیوں دادا! اب اور تو کہیں اپیل نہ ہوگی۔ قیدیوں کا یہیں فیصلہ ہو جائیگا۔

دیبی دین اس سوال کا مطلب سمجھ گیا۔ بولا ——— نہیں ہائی کورٹ میں اپیل ہو سکتی ہے۔

پھر تھوڑی دور تک دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ جالپا ایک درخت کے نیچے کھڑی ہو گئی اور بولی۔ دادا میرا جی چاہتا ہے آج جج صاحب سے مل کر سارا واقعہ کہہ دوں۔ شروع سے جو کچھ ہوا سب کہہ سناؤں۔ میں ثبوت دوں گی تب تو مانیں گے۔

دیبی دین نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ جج صاحب سے؟

جالپا نے کہا۔ ہاں!

دیبی دین پس و پیش کے ساتھ بولا۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہو جی! حاکم کا واسطہ نہ جانے چت پڑے یا پٹ۔

جالپا بولی۔ وہ کیا پولیس والوں سے کہہ نہیں سکتا کہ تمہارا گواہ فرضی ہے۔ کہہ تو سکتا ہے۔

تو آج میں اسی سے ملوں، مل تو لیتا ہے۔

چلو دریافت کریں گے۔ لیکن جوکھم کی بات ہے۔

کیا جوکھم ہے بتاؤ۔

بھیا پر کہیں جھوٹی گواہی کا الجام لگا کر سجا کر دے تو۔

تو کچھ نہیں جو جیسا کرے ویسا بھوگتے۔

دیبی دین نے جالپا کی اس بے دردی پر متحیر ہو کر کہا۔ ایک دوسرا کھٹکا بھی ہے سب سے بڑا ڈر اسی کا ہے۔